ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

رُومی کی چند تشبیہات

(۶)

جوہر و عرض۔ جسم و روح

مولانا اس عقیدے کو بالتکرار دُہراتے ہیں کہ روح انسانی اپنی ماہیت میں جوہر ازلی ہے۔ روح انسانی جوہر ہے اور جہان اس کا عرض ہے:

قالب از ما ہست شد نے ما ازو
جوہر آں باشد کہ قائم با خود است — آں عرض باشد کہ فرعِ او شد است

آدم کو خدا نے علم و قدرت تسخیر دے کر تمام عالم پر محیط بنایا تھا۔ تو بھی آدم زادہ ہے تیری ذات میں بھی وہی صفات و ممکنات موجود ہیں۔ بحرِ ازل کے مقابلے میں یہ جہان زمان و مکان ہے یا یوں کہئے کہ کسی وسیع شہر کے اندر ایک مختصر سا گھر ہے۔ گھر کے اندر کیا چیز ہے جو کثرت سے شہر کے اندر موجود نہیں:

گر تو آدم زادۂ چوں او نشیں — جملۂ ذرات را در خود ببیں
چیست اندر خُم کہ اندر نہر نیست — چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست
ایں جہاں خم است و دل چوں جوئے آب — ایں جہاں حجرہ است و دلِ شہرِ عجاب

جسم کو ایسا سمجھ لو کہ خس و خاشاک کی ایک موٹی سی تہ ہے لیکن اس کے نیچے ایک ندی بہ رہی ہے جو خاشاک پوش ہونے کی وجہ سے نظر سے اوجھل ہے:

جسم ما رو پوش باشد در جہاں — ما چو دریا زیر ایں کہ در نہاں

ابلیس نے آدم کے متعلق یہی غلطی کی کہ وہ اس کی مٹی کو دیکھ سکا لیکن گِل کے اس حجاب سحاب میں جو خورشید تھا اس کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے اس کا منکر ہو کر اس کی تحقیر کرنے لگا۔ جو شخص انسان کو عناصر ہی کا ایک ساز سمجھتا ہے جو ایک دن ٹوٹ کر بے آواز ہو جائے گا اس کی نظر وہی ابلیسانہ نظر ہے خواہ وہ حکماء میں شمار ہوتا ہو:

شاہ دیں را منگر اے ناداں بطین کیں نظر کردہ است ابلیس لعین
کے تواں اندود ایں خورشید را با کفِ گِل تو بگو آخر مرا
گر بریزی خاک و صد خاکسترش بر سرِ نورش ، او بر آمد بر سرش
کہ کِہ باشد کہ بپوشد روئے آب لیں کہ باشد کہ بپوشد آفتاب

منکرِ بقا کے انکار میں اقرار مضمر ہے

آخرت کے منکر جو یہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی زندگی ممکن نہیں اگر یہ لوگ اپنی منازلِ ارتقا پر ایک لمحہ غور کریں تو ان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ آخر یہ تو مانتے ہیں کہ ہم اس زمین کی خاک سے بنے ہیں لیکن اس خاک سے لے کر تیرے شعور تک تیرے کتنے حشر ہو چکے ہیں۔ یہ زور شور سے استدلال کر کے جو انکار کر رہا ہے اس انکار ہی میں اقرار پوشیدہ ہے۔ مٹی کئی منازل سے گزر کر اگر تیرا حکیمانہ استدلال بن سکتی ہے، کہاں مٹی اور کہاں تیرا شعور تو کیا اس کے بعد فطرت کی ارتقائی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ مٹی سے بنے ہوئے باشعور آدمی کا انکارِ حشر اسی قسم کا ہے کہ کوئی صاحبِ خانہ کا دروازہ کھٹکھٹائے اور صاحبِ خانہ اندر سے بولے کہ ہم گھر میں نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کا انکار ہی اس کے گھر پر ہونے کا اقرار ہے:

خاک را و نطفہ را و مضغہ را پیشِ چشمِ ما ہمی دارد خدا
تا بداند در چہ بود آں مبتلا از کجا ہا در رسید او تا کجا

ایں کرم چوں دفعِ آں انکارِ تست
کہ میانِ خاک می کردی نخست

تو کہہ رہا ہے کہ میں مٹی ہوں اور آخر میں مٹی ہو جاؤں گا لیکن مٹی میں یہ مخالفانہ بحثوں کی قوت کہاں سے آگئی۔ جب مٹی استدلال بن سکتی ہے تو اس سے آگے بھی مزید حشر میں نئی ساخت و پرداخت اختیار کر سکتی ہے تیرا اپنے آپ کو مٹی کہہ کر حشر سے انکار کرنا درحقیقت اقرارِ پنہاں ہے:

خاک را تصویر ایں کار از کجا نطفہ را خصمی و انکار از کجا
پس مثالِ تو چو آں حلقہ زنے ست کز درونش خواجہ گوید خواجہ نیست

حلقہ زن ایں نیز دریابد کہ ہست
پس ز حلقہ بر ندارد ہیچ دست

باطنِ حیات کے لامتناہی ممکنات

کائنات میں ہر چیز کا باطن اس کے ظاہر کے مقابلے میں ہزار درجہ زیادہ ہستی رکھتا ہے۔ یہاں تم مٹی کو سب سے ادنیٰ ہستی سمجھتے ہو مٹی نے بھی ظاہر میں خاکساری اختیار کر رکھی ہے لیکن اس کا باطن اس سے برسرِ پیکار رہتا ہے کہ ذرا ٹھیرو ہم تم کو دکھائیں گے کہ ہمارے اندر کیا گیا خزانے پنہاں ہیں۔

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل وہ زر بکف — قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا (آتش)

مٹی کے باطنی ممکنات کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ گل و ثمر کی گوناگونی کی کوئی انتہا نہیں۔ زمین کا سا مصوّر کون ہو سکتا ہے جو فقط مٹی سے ہزاروں قسم کی رنگا رنگ کی تصویریں بنا سکے چشمِ ظاہر بین مٹی ہی سے باطنِ حیات کے ممکنات کا کچھ اندازہ لگائے:

زانکہ دارد خاک شکلِ اغبری — وز دروں دارد صفاتِ انوری
ظاہرش با باطنش گشتہ بجنگ — باطنش چوں گوہر و ظاہر چو سنگ
ظاہرش گوید کہ ما اینیم و بس — باطنش گوید نکو بیں پیش و پس
ظاہرش منکر کہ باطن ہیچ نیست — باطنش گوید کہ بنما ئیم بیست
ظاہرت از تیرگی افغاں کناں — باطن تو گلستاں در گلستاں

تیرا باطن بھی تیرے ظاہر کو پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ تو نے اپنے آپ کو حقیر سمجھ کر کس قسم کے ذلیل فکر و عمل میں مبتلا کر رکھا ہے تجھے معلوم ہی نہیں کہ تکمیلِ حیات اور تسخیرِ کائنات کے کیا لامتناہی ممکنات تیرے اندر مضمر ہیں۔ مشرقی پنجاب کے درویش شاعر بھیک کا کیا عارفانہ شعر ہے:

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گدڑی لال — گرہ کھول نہیں جانتا اس لئے ہے کنگال

دولتِ روح ہی دولتِ ابد قرار ہے

دنیا میں جتنی قسم کی دولتیں بھی نفس سے خارج ہیں مال، جاہ، عزّت، جسمانی صحت، یہ سب بے اعتبار ہیں۔ کیونکہ انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی کسی وقت ضائع ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی روح کے اندر عشق و معرفت کی دولت جمع کرے تو وہ اس کا جزوِ حیات بن جاتی ہے خارجی نعمتیں ضائع ہو سکتی ہیں لیکن نفس کے اندر سموئی ہوئی معرفت و محبت کو کون چھین سکتا ہے۔ دولت با اعتبار و پائدار وہی ہو سکتی ہے جو انسان کی ذات کا جزو لاینفک بن جائے۔ ایسا شخص خود ہی اپنا مال و ملک و بخت و تخت بن جاتا ہے۔ اس کی

سلطنت اس کے اندر ہے جہاں حوادثِ روزگار کو رسائی حاصل نہیں۔ اگر تو محض خارجی نعمتوں کی وجہ سے خوش بخت کہلاتا ہے یا کوئی بڑی سلطنت تیرے ہاتھ آگئی ہے تو اس قسم کا بخت تیری ذات سے خارج ہونے کی وجہ سے یک بیک زائل ہو سکتا ہے لیکن اپنے نفس کو پاکیزہ اور قوی بنا کر تو حوادث کی دستبرد سے بچ سکتا ہے:

گر تو نیکو بختی و سلطان زفت — بخت غیر تست، روزے بخت رفت
تو بمانی چوں گدائے بے نوا — دولتِ خود ہم تو باش اے مجتبیٰ

لیکن باطن میں اپنی خودی کے استحکام سے تیری یہ کیفیت ہو گی کہ:

ہم تو شاہ و ہم تو لشکر ہم تو بخت — ہم تو نیکو بخت باشی ہم تو بخت
چوں تو باشی بختِ خود اے معنوی — پس تو خود بختی ز خود کے گم شوی
تو ز خود کے گم شوی اے خوش خصال — چونکہ عینِ تو ترا شد ملک و مال

شیطان نفسِ امارہ کا دوسرا نام ہے

لوگ نہایت اطمینان اور مسرت کے ساتھ غلط کاری پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ بدعمل کی زشت روئی کو حرص و ہوس خوشنما کر کے پیش کرتی ہے قرآنِ کریم نے بھی گنہ گار کی یہی نفسیات بیان کی ہے۔ زیّن لھم الشیطان اعمالھم۔ شیطان جو بقولِ عارف رومی نفسِ امارہ کا دوسرا نام ہے اعمالِ قبیحہ کو مزیّن اور دلکش بنا کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ حکیم سقراط نے بھی یہی کہا ہے کہ کوئی شخص بدی کرتے ہوئے بدی کو بدی سمجھ کر اس کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس وقت حرص سے مسحور عقل اس عملِ بد کو خیر بنا کر پیش کرتی ہے۔ لیکن شہوات آخر میں راکھ ہو کر رہ جاتے ہیں اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ ذلیل آرزوئیں نفس کا دھوکا تھیں انہوں نے ملمع کو زرِ خالص بنا کر مجھے فریب دیا۔ مولانا اس کی یہ عمدہ مثال دیتے ہیں کہ عملِ بد کو ایک سیاہ رو کوئلہ سمجھ لو جو آتشِ حرص سے فروزاں ہو کر بڑی چمک دمک اختیار کر لیتا ہے لیکن حرص کی آگ کے بجھنے کے بعد یا وہ راکھ ہو جاتا ہے یا پھر اپنی اصل سیہ روئی پر واپس آجاتا ہے:

حرصِ تو در کارِ بد چوں آتش است — اخگرے از رنگِ خوش آتش خوش است
آں سوادِ فحم در آتش نہاں — چونکہ آتش شد، سیاہی شد عیاں
اخگر از حرصِ تو شد فحمِ سیاہ — حرص چوں شد ماند آں فحمِ تباہ
آں زماں کہ فحم اخگرے نمود — آں ز حسنِ کارِ نارِ حرص بود

حرص کارت را بیارائیدہ بود
حرص رفت و ماند کارِ تو کبود

لیکن خیرِ حقیقی میں اپنی ذاتی درخشانی ہوتی ہے۔ اس کی تاباتی عکسِ غیر کی بدولت نہیں:

خیرہا نفزاند نے از عکسِ غیر تابِ حرص از رفت ماند تابِ خیر

بچے طفلانہ حرص اور نادانی کی وجہ سے کبھی کسی چھڑی کو رانوں کے اندر لے کر دوڑتے ہیں اور کبھی اپنے دامن ہی کو گھوڑا سمجھ کر اس پر سواری کرتے ہیں لیکن جوان ہو کر جب ان کو اصل گھوڑوں کی سواری میسر آتی ہے تو اپنی اس طفلانہ حرکت پر ہنستے ہیں۔ یہی حال حقیقی اور غیر حقیقی آرزوؤں کا ہے۔ جاہ و مال کے حریص لوگ طفلانِ نے سوار ہیں جس پر سوار ہو کر وہ اکڑ رہے اور کود رہے ہیں وہ کوئی اصلی سواری ہی نہیں۔

کودکاں را حرص مے آرد غرار تا شوند از ذوق دل دامن سوار
چوں ز کودک رفت آں حرصِ ہدش بر دگر اطفال خندہ آیدش
کہ چہ می کردم چہ می دیدم دریں خل ز عکسِ حرص بنمود انگبیں

سخن کش اور سخن کُش

مثنوی میں دو تین جگہ یہ نکتہ بیان ہوا ہے کہ اچھی باتیں کہنے کا مدار محض کہنے والے کی خوش فکری اور خوش بیانی پر نہیں بلکہ سننے والے کا ذوق اور اس کی استعداد حسنِ تقریر کے محرک ہیں۔ اگر کوئی ملحد تم سے کہے کہ کچھ معرفت کی باتیں تو بیان کیجئے تو تمہاری زبان اور دل کے دروازے بند ہو جائیں گے تمہارے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکے گی۔ اگر کوئی سخن ناشناس کسی اچھے شاعر سے تقاضا کرے کہ اپنا کلام سنائے تو شاعر ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے ایک شعر اس کے منہ سے نہیں نکلتا۔ اگر کوئی بہرا کہے کہ گانا تو سنائیے تو کون مطرب اس کے سامنے گانے پر آمادہ ہو سکتا ہے لیکن جہاں محسوس ہوا کہ تقاضا کرنے والا صاحب ذوق ہے تو طبیعت میں افکار کے پھول کھلنے لگتے ہیں اور تقریر میں یہ پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ سخن کش ہوتے ہیں اور کچھ بد مذاق سخن کُش ہوتے ہیں۔ جہاں سخن کُش شخص سامنے آ بیٹھے تو نکاتِ معانی اس سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح کوئی چور فرار ہوتا ہے سننے والے کے جذبِ صادق ہی سے منہ سے اچھی بات نکلتی ہے اور ذہن نکتہ آفرین ہو جاتا ہے:

گر سخن کش بینم اندر انجمن صد ہزاراں گل بروئیم زیں چمن
ور سخن کُش بینمت اے زن بمُرد می گریزد نکتہ از پیشم چو دُزد

مستمع چوں نیست خاموشی بہ است　　　نکتہ از نااہل گر پوشی بہ است

جنبشِ ہر کس بسوئے جاذب است

جذبِ صادق نے چو جذبِ کاذب است

دنیا کی گہما گہمی اور نشاطِ کار غفلت کی وجہ سے ہے

اس امر میں تمام ادیان کے صوفیہ متفق معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی تمدن کی گہما گہمی زندگی کے اصل مقصود یعنی خدا رسی کی طرف سے غفلت کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ تاجروں کی صبح و شام کی سرگرمیاں، سرمایہ اندوزی کی کوششیں سامانِ زینت و تعیش فراہم کرنے کی مساعیٔ مسلسل۔ اہلِ سیاست کے ہتھکنڈے پیشہ وروں کا اپنے پیشوں میں ایسا انہماک جوان کو مقاصدِ عالیہ سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ جھوٹی تمناؤں کی پیروی، حرص و ہوس کی کش مکش، دنیاوی زندگی زیادہ تر انہیں پر مشتمل ہے۔ اگر زندگی کی اصل غایت لوگوں پر آشکار ہو جائے تو انبیاء اور اولیاء کی طرح لوگ زندگی کی اقل قلیل ضرورتوں پر قانع ہو کر درویشی اختیار کر لیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مشیت الٰہی کا یہ منشاء معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہان اسی قسم کی غفلت کی بدولت قائم رہے۔ اگر خدا کا یہ منشا نہ ہوتا تو زیادہ تر خلقِ خدا اس قسم کی غفلت میں کیوں زندگی بسر کرتی۔ دولت کے لفظ پر مولانا ایک لفظی کھیل کھیلتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس لفظ کے دو جزو ہیں پہلا جزو دوا دَو ہے۔ یعنی شب و روز دوڑ دھوپ اور آخر میں لت ہے یعنی لات مارنا۔ دولت آخر میں لات مار کر انسان کو قبر میں ڈھکیل دیتی ہے:

پس ستونِ ایں جہاں خود غفلت است　　　چیست دولت؟ ایں دوا دَو بالت است

پنجابی میں لات کو لت ہی کہتے ہیں اور لکدزدن کو لت مارنا کہتے ہیں یہاں فارسی اُردو اور پنجابی کا محاورہ ایک ہو گیا ہے۔ شاہ جہانگیر کے سامنے ایک خام مشق شاعر قصیدہ پڑھنے لگا۔ مطلع کا آغاز تھا:

اے تاجِ دولت بر سرت

تقطیع کے لحاظ سے پڑھنے میں اے تاج دو کے بعد ہلکا سا وقفہ ہے اور اس کے بعد لت بر سرت آتا ہے۔ جہانگیر نہایت غضب ناک ہوا اور پوچھا کہ تقطیع جانتے ہو۔ اس نے کہا کہ جی نہیں۔ جہانگیر نے کہا کہ تمہیں معاف کیا اب آگے قصیدہ کی بکواس مت کرو:

اولش دَو دَو باخر لت بخور　　　جز دریں ویرانہ نبود مرگِ خر

تو بجد کارے کہ بگرفتی بدست　　　عیبش ایندم بر تو پوشیدہ شدہ است

زاں ہمی تانی بدادن تن بکار　　　گر بپوشد از تو عیبش کردگار

بر تو گر پیدا شدے زاں عیب شین　　　زاں رمیدے جانت بعد المشرقین

آخر میں جو پشیمانی ہوگی اگر وہ پہلے سے تم پر آشکار ہو جائے تو تم یہ تگ و دو ہی چھوڑ بیٹھو۔ عقلمند آدمی عمر کے آخری حصّے میں جب دہر ناپائدار کے تمام دھوکوں سے آگاہ ہو چکتا ہے تو نہایت درجہ پشیمان ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مولانا ایک اچھی نصیحت کرتے ہیں کہ خالی پشیمانی بے کار چیز ہے۔ پشیمانی میں دستِ تاسف ملتے ہوئے باقی عمر ضائع مت کرو۔ پشیمانی کے معنی ہی یہی ہیں کہ اب تم میں نیک و بد کی صحیح تمیز پیدا ہو گئی ہے اب محض پشیمانی میں نفس کی قوتوں کو ضائع کرنے کی بجائے جو نیکی بھی میسر آئے کرو۔ حق پرستی و حق کوشی شروع کرو تاکہ تلافیِ مافات ہو سکے:

آں پشیمانی قضائے دیگر است — پس پشیمانی بہل حق را پرست
ور کنی عادت پشیماں خور شوی — زاں پشیمانی پشیماں تر شوی
نیم عمرت در پریشانی رود — نیم دیگر در پشیمانی شود
ترکِ ایں فکر و پشیمانی بگو
حال و کار و یارِ نیکو تر بجو

مطبوعاتِ مجلسِ ترقیٔ ادب

غیب و شہود	مصنّفہ سید نذیر نیازی	۳-۴-۰
تعارف جدید سیاسی نظریہ	مترجمہ عبدالمجید سالک و عبدالمحصی	۲-۱۲-۰
حکمتِ قرآن	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم	۱-۰-۰
دولتِ اقوام	مترجمہ شیخ عطاء اللہ و فخری	(زیرِ طبع)
فلسفۂ شریعتِ اسلام	مترجمہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ	۵-۰-۰
نظامِ معاشرہ اور تعلیم	مترجمہ عبدالمجید سالک و عزیز	۴-۰-۰

(ملنے کا پتہ)

سکریٹری بزمِ اقبال و مجلسِ ترقی ادب۔ ترسنگداس گارڈن۔ لاہور